کتاب نما

شیخ سرہند، مرتب: جمیل اطہر سرہندی۔ ناشر: ادارۂ اسلامیات، انار کلی، لاہور۔ صفحات: ۲۵۶۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

شیخ احمدؒ سرہندی، برعظیم پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افغانستان اور وسط ایشیا میں مجدد الف ثانیؒ (اسلامی تقویم کے دوسرے ہزارویں سال میں دین کی تجدید کرنے والے) کے لقب سے مشہور ہیں۔ وہ مسلمانوں کی علمی، فکری اور روحانی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے، اور چشتی، قادری سلسلے میں بیعت ہوئے۔ مگر پھر ان کی ملاقات خواجہ عبدالاحدؒ سے ہوئی، جن سے انھوں نے نقش بندی سلسلے میں بیعت اور خلافت پائی۔ صوفیا میں یہ واحد سلسلۂ رشد ہے جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وساطت سے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ نسبًا وہ فاروقی تھے اور ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ تصوف کو غیر اسلامی اعتقادات اور طریقوں سے پاک کرنا ہے۔ انھوں نے مداہنت کیش علما، حیات مستعار کے پرستار امرا، جاہ و اقتدار کے طلب گار حکام اور غفلت و کسل مندی کے شکار بدقسمت عوام کو بھی اس عزیمت کی طرف دعوت دی جو شعار اسلام کے غلبے کی طرف لے جاتی ہے۔

ہماری مسلم فکر کے بہت سے تذکرہ نگاروں نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ ساری اصلاحی کوششوں کے باوجود وہ بھی اس بخت نارسا کی ماری قوم کو تصوف کی افیون ("چنیا بیگم") دے گئے۔ میرے خیال میں تاریخ کی حرکیات کو پوری طرح نہ سمجھ پانے سے اس طرح کے فکری مغالطے لاحق ہو جاتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندی کا عہد سیاسی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں سے ناآشنا تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے نمونے اور تمثال کے ذریعے ہی رشد و ہدایت اور ہمہ گیر تبدیلی کے لیے کام کیا، خواص اور عوام کے مختلف طبقوں تک بیعت و ارشاد کے صوفیانہ سلسلے سے پورا پورا کام لیا۔ اپنے سلسلے اور مریدوں کا جال، پورے ہندستان اور ملک سے باہر شمال مغرب میں پھیلا دیا، متعدد تصانیف کے علاوہ خط و کتابت کے وسیع سلسلے سے اپنی دعوت پھیلائی (ان کے مکتوبات کے تین دفتر ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو کر اشاعت پذیر ہو گئے تھے) اور ہندستان کو ایک غیر مسلم ملک بن جانے سے بچا لیا۔ اسی حقیقت کے اعتراف میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں　　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

بیسویں صدی میں یہ سعادت مولانا ابوالکلام آزادؒ کو نصیب ہوئی کہ انھوں نے اس عہد میں سب سے

پہلے مجددؒ کے تجدیدی کارنامے کی طرف توجہ دلائی۔ تقسیم ہند سے پہلے اور پاکستان کے قیام کے بعد مجدد کی تصانیف (خصوصاً مکتوبات) کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی اور ان کے نظریات اور فکر و فلسفے پر مضامین اور مستقل تصانیف کا ایک غیر مختتم سلسلہ نظر آتا ہے۔ جمیل سرہندی کی مرتبہ، پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

گہری عقیدت و محبت سے مرتب کی ہوئی اس خوب صورت کتاب میں مرتب کے اپنے سات مضامین کے علاوہ دیگر اہل قلم کے سولہ مضامین اور متعدد منظوم نقوش عقیدت شامل ہیں۔ اگرچہ فکر مجدد کو عام کرنے والی ہر کوشش لائق تحسین ہے، تاہم محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے نہایت عجلت میں مختلف اخبارات و رسائل سے مجددؒ پر شائع شدہ مضامین کو جمع کر کے کتابی صورت دے دی ہے (ان مضامین کے مصادر بھی نہیں دیے گئے۔ مرتب کا کہنا ہے کہ یہ مضامین، مجددؒ سے متعلق جلسوں میں پڑھے گئے)۔ دو تین مضامین کے علاوہ تقریباً سبھی مضامین میں ایک ہی طرح کا مواد بار بار پڑھنے میں آتا ہے، آپ کہاں پیدا ہوئے، کس کس سے بیعت کی، کون سے سفر کیے، جہانگیری دربار میں پیشی، قید و بند، حلقہ ارادت، سلسلۂ دعوت، وفات اور اثرات مابعد وغیرہ۔ چونکہ بیشتر مقالات کا انداز علمی و تحقیقی نہیں، بلکہ خوش عقیدتی کا ہے، اس لیے بہت سی کمزور روایتیں، کرامتوں کی داستانیں (اپنی مرضی سے قید ہوئے تھے، ص ۳۵، ۳۶) اور بادشاہ کی عقیدت کی ضعیف حکایتیں ("بادشاہ نے اپنی گستاخیوں پر ندامت کا اظہار کیا... حضرت سے شیفتگی کا یہ عالم ہوا کہ وہ انھیں ہمیشہ شاہی کیمپ میں ساتھ رکھتا تھا، یوں عظیم الشان مغل سلطنت کو خدا کے ایک درویش نے بے دام خرید لیا...." ص ۵۷) جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ مجددؒ کی اس بے باک فکر کو اجاگر کیا جائے، جو مال و دولت دنیا سے بے اعتنائی، نیز جاہ و حشم اور اقتدار کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا سے گریز کے بجائے اسے بدل دینے کے عزم، اور اس کے لیے قرآن و سنت نبویؐ کی حقیقی روح کو زندگی میں سمو لینے سے عبارت ہے۔ (پروفیسر عبدالقدیر سلیم)

برصغیر میں مطالعۂ قرآن، (فکر و نظر کا خصوصی شمارہ)، جنوری تا جون ۱۹۹۹، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔ صفحات: ۳۹۵۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

ادارہ تحقیقات اسلامی، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کی زیر سرپرستی، علمی تحقیق کے میدان میں وقیع اور قابل قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب وقتاً فوقتاً اہم موضوعات پر سیمی نار منعقد کرتے ہیں۔ ادارہ تحقیقات اسلامی نے ۲۸ اپریل تا یکم مئی ۱۹۹۷ کو برعظیم میں مطالعۂ قرآن کی کوششوں کا جائزہ لینے اور علمی حلقے کو اس سے متعارف کرانے کے لیے ایک چار روزہ سیمی نار منعقد کیا جس میں ۲۳ مقالے پڑھے گئے۔ ان میں سے سولہ مقالات زیر نظر شمارے میں پیش کیے گئے ہیں۔

باب اول (علوم القرآن) میں چھ مقالے ہیں۔ باب دوم (تفسیر اور مفسرین) میں آٹھ مقالے ہیں اور باب سوم (مخطوطات) میں دو مقالے ہیں۔ ہر مقالہ اپنے موضوع پر دلچسپ اور نادر معلومات فراہم کرتا ہے اور بعض تو جامعیت، ندرت اور گہرائی اور گیرائی میں مثالی مقام رکھتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ان مقالوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر عبدالرشید رحمت "قرآن فہمی کے اصول کے کام کا جائزہ" میں برعظیم کے نامور مفسرین کے تفسیری اصولوں کو زیر بحث لائے ہیں۔ بعض امور قابل توجہ ہیں۔ مقالے میں ترتیب، شخصیات، ان کے کام اور زمانے کے لحاظ سے نہیں ہے۔ وحید الدین خان اور ڈاکٹر اسرار احمد کا ذکر کسی بھی لحاظ سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے ذکر سے مقدم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر اس بحث میں غلام احمد پرویز کا ذکر صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ پرویز کے اصول، قرآن فہمی کے اصول نہیں بلکہ تحریف قرآن کے اصول ہیں۔ کسی آدمی کے بارے میں اصل حقائق کو واضح نہ کرنا بلکہ ان پر پردہ ڈالنا تحقیق نہیں ہے۔ غلام احمد پرویز سنت کا منکر ہے لیکن ڈاکٹر عبدالرشید رحمت فرماتے ہیں: وہ سنت کو مآخذ اول نہیں مانتا۔ حالانکہ وہ سنت کا منکر ہے اور اطاعت رسولؐ کے اصول کا بھی منکر ہے۔ اس کے بعد "برعظیم میں مطالعہ قرآن: تراجم و تفاسیر" از ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم ہے جس میں مقالہ نگار نے ۱۱۷ھ میں محمد بن قاسمؒ کی آمد سے لے کر عہد حاضر تک عربی، فارسی، ہندی، سندھی، پشتو، پنجابی، بنگلہ، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں (گجراتی، سنسکرت، ملیالم، مرہٹی، تامل، گورمکھی، براہوی، کناری، سرائیکی) میں ہر نوع کے ترجمے اور تفسیر کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے، تاہم بعض اہم مفسرین مثلاً مولانا حسین علی واں بچھراں، مولانا غلام اللہ خان راولپنڈی، مولانا قاضی شمس الدین گوجرانوالہ، مولانا قاضی نور محمد قلعہ دیدار سنگھ اور مولانا محمد طاہر پنج پیر مردان کا ذکر اس مقالے میں نہیں آسکا۔ یہ بڑی فروگذاشت ہے۔ اسی طرح گذشتہ عرصے میں روسی زبانوں اور فارسی زبان میں تفہیم القرآن کا ترجمہ پیش کر کے ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں پھیلایا گیا ہے، اس کا تذکرہ بھی رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر فضل احمد نے برعظیم میں لغات القرآن کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ سید عارف حسین نقوی نے شیعہ علما کی تفسیری خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ سیدہ شگفتہ خانم نے اعجاز قرآنی پر ایک مؤثر، جامع اور دلآویز مقالہ پیش کیا ہے۔ مضامین قرآن کے اشاروں پر عبدالعزیز عرفی نے بیش قیمت نکات پیش کیے ہیں۔

باب دوم میں، تفسیر بیان القرآن (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کا جائزہ پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثانی نے، تفسیر مرادیہ (حضرت شاہ مراد اللہ سنبھلی) کا تعارف سید ابوالخیر کشفی نے، التفسیرات الاحمدیہ (ملاجیون) کا تعارف ڈاکٹر محمد طفیل نے اور تفہیم القرآن (سید ابوالاعلیٰ مودودی) کا جائزہ ڈاکٹر خالد علوی نے پیش کیا ہے۔ علوی صاحب کا جائزہ سیر حاصل اور جامع ہے اور موصوف نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

افتخار الحسن میاں نے تفسیر ضیاء القرآن کا، بعض معاصر تفاسیر (بیان القرآن، ترجمان القرآن، تفسیر ثنائی اور تفہیم القرآن) سے مقابلہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک ضیاء القرآن کا ترجمہ بامحاورہ ہے اور تحت اللفظ بھی۔ وہ اس بات کو ثابت کرنے میں خاصی حد تک کامیاب ہیں۔ البتہ ضیاء القرآن کے بعض تفسیری نکات محل نظر ہیں۔

خورشید احمد ندیم کا مضمون "برصغیر کی چند اہم تفاسیر: ایک تقابلی جائزہ" جامع اور موثر ہے اور حقیقت پسندانہ بھی لیکن غلام احمد پرویز کا تذکرہ یہاں بھی محل نظر ہے۔ کسی طرح بھی اس کا تذکرہ مفسرین میں صحیح نہیں ہے۔ "بلوچستان میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر" از پروفیسر انعام الحق کوثر، بہت مفید اور معلوماتی مقالہ ہے۔ ڈاکٹر احمد خان نے مبہمات القرآن کے موضوع پر چند اہم کتب کا تعارف کرایا ہے۔ مبہمات سے مراد وہ آیات ہیں جس کا مصداق متعین اور معلوم نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد شریف سیالوی نے مسعود جھنڈیر اسلامیہ لائبریری مبلسی کا تعارف پیش کیا ہے اور وہاں کے عربی فارسی مخطوطات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے موضوع پر یہ خاص نمبر ایک اچھی دستاویز ہے۔ (مولانا عبدالمالک)

ہندوستانی مسلمان، ایام گم گشتہ کے پچاس برس، ڈاکٹر راشد شاز۔ ترتیب و تدوین: کوثر فاطمہ۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز، علی گڑھ۔ صفحات: ۳۶۰۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

بھارت کے مخصوص پیچیدہ اور دشوار سیاسی ماحول میں ۱۹۸۵ میں ایک "ادارہ برائے جملہ امور امت اسلامیہ" قائم کیا گیا تھا تاکہ مسلمانان ہند کی مشکلات اور پریشانیوں پر علمی انداز سے غور و فکر کرے اور انھیں ۱۹۴۷ کے بعد پیش آمدہ حالات کی پیدا شدہ مرعوبیت اور کمزور پوزیشن کے ماحول سے نکلنے کی راہ دکھلائے۔ اس پس منظر میں مصنف نے یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں امت اسلامیہ ہند جن اہداف کے حصول کے لیے کوشاں رہی ہے، وہ سرے سے اسلامی ایجنڈا تھا ہی نہیں بلکہ ہم دشمنوں کے ایجنڈے کو اپنا ایجنڈا سمجھ کر اور ان کے اہداف کو اپنا نصب العین بنا کر، ان کے حصول میں اپنی قوت کو ضائع کرتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ گذشتہ ۵۰ سالوں میں ہماری کوئی پیش قدمی تو کیا ہوتی، ہم اس حیثیت میں بھی باقی نہیں رہ گئے ہیں جہاں ہم آج سے ۵۰ سال پہلے موجود تھے۔

مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد سے مسلمانان ہند ایک بدترین سیاسی محکومی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ سیکولر ڈیموکریسی نے انھیں بحیثیت ملت پراگندہ، منتشر، بدحواس اور بے وزن کر کے رکھ دیا ہے۔ بھارت میں ۲۰ کروڑ مسلمان رہتے ہیں لیکن پارلیمنٹ میں مسلم ارکان کی تعداد ان کے عددی تناسب سے ہمیشہ ہی بہت کم ہوتی ہے۔ وہ ہندستان کی کل تعداد کا پانچواں حصہ ہیں۔ اس لحاظ سے ملکی پارلیمنٹ میں ان کا تناسب بھی اسی قدر ہونا چاہیے چنانچہ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی

ہے۔ مصنف نے اس کا حل متناسب نمایندگی کی بنیاد پر جداگانہ طریقۂ انتخاب تجویز کیا ہے اور اس ضمن میں ڈاکٹر راشد شاز کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دستورِ ہند ترامیم اور تبدیلی کا متقاضی ہے۔

ایک مضمون میں مصنف نے ہندستان کے بے شمار فرقہ وارانہ فسادات کو قطعی طور پر ریاستی دہشت گردی سے تعبیر کیا ہے، جہاں غیر مسلم بلوائیوں کے ساتھ منظم پولیس اور پیراملٹری فورسز شامل ہوتی ہیں تاکہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ جانی و مالی نقصان پہنچایا جائے اور مقدمات بھی انھی کے خلاف قائم کیے جائیں۔ ان وارداتوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمان خوف اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا رہیں اور کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ رہیں۔

مصنف کا خیال ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کا سا نام رکھ کر کسی غیر اسلامی نظام کے غلبے کے لیے کوشاں ہیں، یا جو موجودہ سیکولر ڈیموکریسی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، یا جو مسلمانوں کی جدوجہد سے کفار و مشرکین کو اس ملک کا اقتدار سونپنے کے لیے شب و روز متحرک ہیں تو یہ سب کے سب صریح شرک میں مبتلا ہیں۔ اس ملک کی تباہ حالی، وسائل کا اتلاف، معاشی ناہمواریاں، سماجی بے چینی اور ملک میں ہر لمحہ جاری خانہ جنگی کی سی کیفیت آپ سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایک بار پھر اس سرزمین کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پالیسی ساز، ملک کے بنیادی مسائل سے توجہ ہٹا کر، ملک کے وسائل کا ایک بڑا حصہ اسلحوں کی تیاری اور نیوکلیائی مادوں کے حصول میں ضائع کر رہے ہیں۔ ملک کے وسائل کو آخر کب تک ہم یوں تباہ و برباد ہوتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔ اس ملک کے ۲۰ کروڑ اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ اس وطن عزیز کو ایک صالح قیادت دینے کے لیے اپنی تیاری تیز تر کر دیں۔ اس ضمن میں، کتاب کے آخر میں ملی پارلیمنٹ کے اعلیٰ سطحی اجلاس (نئی دہلی، فروری ۱۹۹۸) میں جاری کردہ منشور دیا گیا ہے جس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس وقت تک انتخابات سے لاتعلق رہیں، ووٹ کا استعمال نہ کریں، جب تک ایک اسلامی سیاسی پارٹی کی تشکیل نہیں ہو جاتی اور ایک اسلامی متبادل سامنے نہیں آجاتا۔

مصنف کی تحریر میں ایک انقلابی دعوت کا پیغام ہے۔ کیا عجب کہ اس دعوت کے ذریعے امت میں رجوع الی القرآن کا داعیہ پیدا ہو اور وہ اپنے اندر سے اپنی جملہ کمزوریوں، ضعف ایمان، ضعف کردار، بے عملی، اجتماعی پراگندگی اور لایعنی رسوم کے خاتمے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ بہرحال یہ بے لاگ مضامین نہ صرف ہندستان میں بلکہ جملہ اسلامی دنیا کے لیے بھی غیر معمولی طور پر اہمیت کے حامل اور گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ (انیس احمد اعظمی)

طریقت کی حقیقت، غلام علی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۰۴۔ قیمت: ۱۳۰ روپے۔

فاضل مصنف نے تصوف اور اس کے متعلقات کا مفصل تجزیہ اور محاکمہ کیا ہے۔ نو ابواب پر

مشتمل اس کتاب میں، مصنف نے تصوف کی تاریخ، اصلاح نفس اور شریعت، غیر اسلامی عقائد اور اعمال کے اسباب، برعظیم میں تبلیغ اسلام، رسم عرس اور قرآن کریم کی رو سے اولیاء اللہ جیسے عنوانات کے ضمن میں مفصل بحث کی ہے۔ "پیش لفظ" میں رقم طراز ہیں: "اس کتاب میں صوفیا اور فقہا کے باہمی اختلاف کا ذکر بھی ہے اور تصوف کی خرابیوں پر مشہور مذہبی شخصیات کی رائے بھی دی گئی ہے۔ گوشہ نشینی کی حمایت اور مخالفت کے دلائل بھی شامل کیے گئے ہیں" (ص ۱۲)۔

غلام علی صاحب نے تصوف کے بعض مسلمہ عقائد کو غیر اسلامی بتایا ہے۔ مثلاً: نظریۂ وحدت الوجود کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے اسے اسلام کی جامعیت کے لیے ضرر رساں ٹھہرایا ہے (ص ۱۱)۔ اس باب میں وہ علامہ اقبالؒ سے متاثر ہیں، کیونکہ علامہ نے بھی امام ابن تیمیہؒ کے زیر اثر فصوص الحکم کے مفاہیم اور مکاشفات کو زندقہ اور الحاد سے تعبیر کیا تھا۔ اگرچہ بعد میں وہ شیخ اکبرؒ کی عظمت اور فضیلت کے قائل ہو گئے تھے (دیکھیے: تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، جاوید نامہ اور ارمغان حجاز)۔ ابتدا میں ابن عربیؒ کی مخالفت کی وجہ غالباً یہ تھی کہ علامہ موصوف نے شیخ کی تصانیف کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ۸/اگست ۱۹۳۳ کو پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ کے نام لکھتے ہیں: "حضرت شیخ اکبرؒ نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا تھا اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے؟... "یہ تعلیم شیخ اکبرؒ کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں؟ اس کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں، خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں"۔

دراصل علامہ اقبالؒ نے ۱۹۰۸ کے قریب قریب امام ابن تیمیہؒ کے توسط سے شیخ کے بارے میں ایک رائے قائم کی اور ان کے نظریۂ وحدت الوجود کو ملت اسلامیہ کے زوال اور انحطاط کا باعث قرار دیا۔ حالانکہ ان کے مرشد مولانا رومؒ بھی اسی نظریے کے قائل اور مؤید تھے۔ علامہ اقبالؒ کی توانا اور زوردار شخصیت کے زیر اثر، بعد میں تصوف پر لکھنے والے اکثر و بیشتر مصنفین نظریۂ وحدت الوجود کو غیر اسلامی، عجمی، یونانی اور ہندی تہذیب کے افکار و نظریات کا ملغوبہ بتاتے رہے، حالانکہ شیخ اکبرؒ نہ تو اتحاد کے قائل تھے اور نہ حلول کے، بلکہ ان کے افکار تشبیہ اور تنزیہہ کے معاملات سے بھی پاک اور منزہ ہیں۔ فتوحات مکیہ کی ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ: "خدا خواہ کتنا نزول فرمائے، خدا ہے، بندہ خواہ کتنا عروج پا لے، بندہ ہے" (فتوحات مکیہ، جلد اول، مترجم: صائم چشتی، علی برادران، فیصل آباد، ص ۱۷)۔

شیخ اکبرؒ وحدت الوجود کے سب سے بڑے شیخ اور پرچارک بھی تھے۔ یہ نظریہ عجمی تصورات کا مجموعہ نہیں، بلکہ عین اسلامی ہے۔ اسے نہ تو ایرانی "ہمہ اوست" سے کچھ علاقہ ہے اور نہ انگریزی Pantheism سے۔ یہ تصور ہندی افکار (حلول اور اتحاد) سے بھی الگ اپنی پہچان رکھتا ہے اور یونانی تصور احدیت (Monoism) سے بھی اسے کوئی نسبت نہیں۔ پیش نظر کتاب میں وحدت الوجود کے ضمن میں

حلول و اتحاد اور ہمہ اوست واحدیت کے تصورات میں خط تفاوت نہیں کھینچا گیا اور ان تمام اصطلاحات کو مترادفات کے طور پر برتا گیا ہے، جو غلط اور ناانصافی پر مبنی ہے۔ کتاب کے اکثر مقامات پر اختلاف رائے کی گنجایش موجود ہے، لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔

کتاب لائق مطالعہ ہے۔ مصنف نے بڑی محنت سے اسے ترتیب دیا ہے۔ ان کا انداز تحریر استدلالی اور ان کا رویہ علمی ہے۔ کتاب میں کہیں بھی جذباتیت کا شائبہ نہیں پایا جاتا اور یہی کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ تصوف کے حق یا مخالفت میں، خاصا لوازمہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ (عبدالعزیز ساحر)

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط، مرتبہ عبدالعزیز ساحر۔ ناشر: حسنین پبلی کیشنز، ۱۱۔ ندیم پارک، گلشن راوی، لاہور۔ صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کے ہاں تجدد کی لہر بڑی قوت سے اٹھی، لیکن ان میں کئی متجددین کو اللہ تعالیٰ نے نور ہدایت عطا کیا، اور وہ اپنی سابقہ سوچ سے رجوع کر گئے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق (۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۵) ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

ڈاکٹر برق نے دین اسلام کے حوالے سے تشکیک و ریب پر مبنی کتب لکھ کر کچے ذہن کے کئی نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کیا، لیکن جب انھیں اپنے موقف کی غلطی معلوم ہوئی تو انھوں نے رجوع کر لیا۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''کسی وقت میرے عقائد میں کجی رہی.... کیا بعد از توبہ بھی پچھلے گناہ معاف نہیں ہوتے؟'' (ص ۴۰)۔ اور یہ کہ: ''اللہ کی ہستی سے انکار کوئی گدھا ہی کر سکتا ہے'' (ص ۴۷)۔ اور یہ کہ: ''۱۹۵۲ کے بعد میں نے حدیث کے متعلق اپنا موقف بدل لیا تھا--- [اب] میرے عقائد وہی ہیں، جو اہل سنت کے ہیں'' (ص ۳۰)۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کے دور کج روی کی تخلیقات کو بعض ناشرین ابھی تک شائع کر رہے ہیں (حالانکہ اس کا کوئی جواز نہیں ہے)۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کی جواب دہی ناشر حضرات کو آخرت میں کرنی ہو گی۔

نوجوان محقق عبدالعزیز ساحر نے برق مرحوم کے خطوط بڑی محنت سے جمع کر کے مرتب کیے ہیں۔ خطوط کے مکتوب الیہم کا تعارف بھی شامل کتاب ہے اور خط کے مندرجات میں جو امور وضاحت طلب تھے، ان کی تفصیلات (ص ۱۵۰۔ ۲۰۶) کو تحقیقی ذوق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ابتدا میں برق مرحوم کا سوانحی خاکہ دیا گیا ہے (مع ان کی تصانیف کے)۔ پھر ان کے افکار و نظریات کا ایک مطالعہ و جائزہ ہے، اور آخر میں برق کی دست نوشت تحریروں کے عکس بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب ترتیب و تدوین کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ (سلیم منصور خالد)